شفیق عہدی پوری

نیرنگِ خودی

پیغامِ اقبال کا جزوِ اعظم جسے ''اساسِ پیغام'' بھی کہا جا سکتا ہے ''خودی'' یا ''انا'' ہے جسے صدیوں سے غرور و تکبر کے معنی میں محصور رکھا گیا ہے ۔ در حقیقت یہ لفظ (خودی) مسلمانوں کے زوال و انحطاط سے ان معنی میں مستعمل ہوتا شروع ہوا ، اور اسے زیادہ تر صوفیائے کرام نے استعمال کیا ۔ وہ اسے نفسِ انسانی کی رذیل صفت گردانتے رہے ۔ اس لیے ریاضات و مجاہدات میں نفس کی تادیب و اصلاح کے لیے اسے بے دریغ مذکورہ معنی میں استعمال کرتے رہے ، حتیٰ کہ ''خودی'' کا صرف ایک ہی پہلو نظر کے سامنے رہا ۔ دوسرا پہلو دیکھنے اور اس پر غور و فکر کرنے کی کسی نے ضرورت ہی نہ سمجھی ۔ اس طرح اس گراں قدر جوہرِ فطرت کو صفاتِ رذیلہ کا مظہر سمجھ کر ہمیشہ اس سے پرائے بیٹے کا سلوک روا رکھا گیا ۔

اقبال کا یہ ایک بڑا کارنامہ ہے کہ اس نے ''خودی'' کے دوسرے پہلو سے پردہ اُٹھایا اور نفسِ انسانی کے اس جوہر کو دنیا کے سامنے اس طرح پیش کیا کہ ''خودی'' کا پُر نُور پیکر ایک لعلِ بے بہا کی صورت میں نظر نواز اور خرد افروز ہوا ، جس سے انسان نے اپنے آپ کو سمجھا اور اپنا تشخص قائم کرنے میں کامیاب ہوا ۔

''خودی'' کے معنی خود شناسی اور خود آگاہی کے ہیں ۔ انسان کو خدائے تعالیٰ نے اپنا خلیفہ بنا کر بے شمار قوائے ظاہری اور مخفی کا خزینہ دار و امانت گزار بنایا ہے ، مگر جب تک اسے اپنے مرتبے اور فرائض سے آگاہی نہ ہو ، کوئی بھی درست اور صحیح عمل انجام نہیں

دے سکتا ۔

ایک حاکم اور فرماں روا کا یہی کام نہیں کہ وہ مسندِ زرنگار پر مونچھوں کو تاؤ دے کر بیٹھے ، بلکہ اسے اپنے مرتبے اور فرائض کا احساس بھی لازمی ہے ۔ اگر وہ صرف مٹی کا مادھو ہے تو وہ نہ اپنا تشخص قائم کر سکے گا ، نہ فرائضِ مفوضہ کو ادا کرنے سے عہدہ برآ ہو سکے گا ۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ ایسا فرماں روا نہ کوئی فرمان صادر کر سکتا ہے نہ رعایا پر حکومت کرنے کا اہل ہے ۔ یہی کم نصیبی اسے ذلیل و خوار کر کے تختِ حکومت سے فرشِ خاک پر پٹخ دے گی اور ذلت و رسوائی کے سوا اس کے حصے میں کچھ نہ آئے گا ۔

غلامی ایک ایسی بد بختی ہے جو ''خودی'' کو یاس و قنوطیت کے سیلاب کی نذر کر دیتی ہے ۔ غلام کو مایوسی اپنے تشخص کے قیام اور اظہار کا موقع ہی نہیں دیتی ۔ اس کے دل میں آرزوئیں پیدا ہوتی ہیں ، نہ زندہ ولولے اور جذبات اُبھرتے ہیں ، اور زندگی صرف خورد و نوش تک محدود ہو جاتی ہے جس کے باعث اسے حیوانات سے متمیز کرنا ممکن نہیں رہتا ۔

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے ۔ خودی کے دو پہلو ہیں جن سے خودی دو قسموں میں منقسم ہو جاتی ہے ۔ ایک کو شیطانی خودی کہتے ہیں اور دوسری کو رحمانی خودی ۔ شیطانی خودی سے محفوظ رہنے کے لیے ہی ریاضیین نے اسے غرور و تکبر سمجھا ، کیونکہ اسی نے ابلیس کو شیطان بنایا اور راندۂ درگاہ قرار دے کر ذلت و نامرادی کے تاریک گڑھے میں دھکیل دیا ۔ اس کے مقلد حزب الشیطان کے نام سے موسوم ہوئے ۔ رحمانی خودی ''انسانیت نما'' اور ''خدا رسا'' ہے ۔ اسی سے خاکی انسان آسمان کی بلندیوں میں قابلِ پرواز طاقت حاصل کرتا ہے ، شاہ و امرا کے رعب سے بے نیاز ہو جاتا ہے اور ''حزب اللہ'' میں داخلہ پاتا ہے ۔ جب کسی قوم میں رحمانی خودی کی نمود ہوتی ہے تو وہ کسی کی غلامی قبول نہیں کرتی ، بلکہ خود حکم ران اور فرماں روا بن جاتی ہے ۔

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی بعثت سے قبل عرب کی جو حالت تھی وہ تاریخ سے پنہاں نہیں ہے ۔ عربوں کا نہ کوئی اپنا

تشخص تھا نہ کوئی مقام ۔ رومیوں نے دبایا تو دب گئے ، ایرانیوں نے بھگایا تو بھاگ اُٹھے ، مگر جب حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے انھیں رحمانی خودی سے آشنا کیا تو ان کی نظر میں نہ روم کی وقعت رہی نہ ایران کی ۔ دونوں سے بہ یک وقت بھڑے اور دنیا کی دو بڑی حکومتوں کو پارہ پارہ کر کے رکھ دیا ، حالانکہ ان کے ہاں نہ کوئی فوج تھی ، نہ انھیں جنگی تربیت حاصل تھی ، نہ ہتھیار تھے ، نہ اسلحہ کے کارخانے ، نہ خوراک و رسد کے ذخائر تھے ۔ وہ بھوکے تھے ، ننگے تھے ، مگر خودیٔ رحمانی کے سرمایہ دار تھے ۔ یہی خودی ان کے دلوں میں ولولے اور جوش کے سیلاب پیدا کر رہی تھی ۔ وہ بادشاہوں اور شہنشاہوں کو انسان نما حیوان سمجھتے تھے اور حکومت و فرماں روائی کو صرف اپنا حق تصوّر کرتے تھے ۔ وہ کمزوروں کی مدد کر کے ان میں رحمانی خودی پیدا کرنا چاہتے تھے ۔ چنانچہ وہ دنیا پر چھا گئے ، اور اپنے اعمال و کردار سے ، جو رحمانی خودی کی پیداوار تھے ، دنیا کے لیے ایک حسین نمونہ بن گئے ۔ مگر جب خودی سے ہاتھ اُٹھا لیا اور اپنا تشخص بھول گئے ، تو ایک وہ وقت بھی آن پہنچا کہ یاس و قنوطیت کو گلے لگا بیٹھے اور خدائے تعالیٰ کا فرمان ''و انتم الاعلون ان کنتم مومنین'' فراموش کر دیا ، زندگی کے بجائے موت سے ہم آغوش ہو گئے ، حکومتیں مٹ گئیں ، سلطنتیں لٹ گئیں ، نہ عزت رہی نہ آبرو ، نہ مال رہا نہ دولت ، آزادی رہی نہ حریت ؛ غلامی اور بد بختی مقدر بن گئی ۔

''من عرف نفسہ فقد عرف ربہ'' [جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا اس نے اپنے رب کی معرفت حاصل کر لی] ۔ یہ نفس ہی خودی کا منبع ہے جس کا ایک پہلو خصائصِ رذیلہ کا نمائندہ ہے ، اور دوسرا خصائصِ شریفہ کا ۔ یہ دونوں یعنی نار و نور انسانی نفس میں موجود ہیں ۔ خودی کی پرورش کا مقصد یہ ہے کہ خصائصِ شریفہ کو اپنایا جائے اور خصائصِ رذیلہ کو اس طرح کنٹرول کیا جائے کہ یہ حصہ دب جائے اور انسان کو رذیل ہونے سے محفوظ رکھے ۔

اقبال نے خودی کے اسی پہلو کی ترجمانی کی اور انسان کو انسانی تشخص سے بہرہ ور کرنے کا بیڑا اُٹھایا ۔ ''اسرارِ خودی'' (۱۹۱۵) کے

دیباچے میں فرماتے ہیں :

''۔ ۔ ۔ شاعرانہ تخیل محض ایک ذریعہ ہے اس حقیقت کی طرف توجہ دلانے کا کہ لذتِ حیات 'انا' کی انفرادی حیثیت ، اس کے اثبات ، استحکام اور توسیع سے وابستہ ہے ۔ ۔ ۔ ۔ یہ لفظ اس نظم میں بمعنی غرور استعمال نہیں کیا گیا جیسا کہ عام طور پر اُردو میں مستعمل ہے ۔ اس کا مفہوم محض احساسِ نفس یا تعینِ ذات ہے ۔ ۔ ۔ ۔''[۱]

''رموز بے خودی'' (۱۹۱۸) کے دیباچے میں فرماتے ہیں :

''جس طرح حیات افراد میں جلبِ منفعت ، دفعِ مضرت ، تعینِ عمل و ذوقِ حقائقِ عالیہ ، احساسِ نفس کے تدریجی نشو و نما ، اس کے تسلسل ، توسیع اور استحکام سے وابستہ ہے ، اسی طرح ملل و اقوام کے حیات کا راز بھی اسی احساس یا بالفاظِ دیگر 'قومی انا' کی حفاظت ، تربیت اور استحکام میں مضمر ہے اور حیاتِ ملیہ کا انتہائی کمال یہ ہے کہ افرادِ قوم کسی آئینِ مسلم کی پابندی سے اپنے ذاتی جذبات کے حدود مقرر کریں تاکہ انفرادی اعمال کا تبائن و تناقض مٹ کر تمام قوم کے لیے ایک قلبِ مشترک پیدا ہو جائے ۔ افراد کی صورت میں احساسِ نفس کا تسلسل قوتِ حافظہ سے ہے ۔ اقوام کی صورت میں اس کا تسلسل و استحکام قومی تاریخ کی حفاظت سے ہے ۔ گویا قومی تاریخ حیاتِ ملیہ کے لیے بمنزلہ قوتِ حافظہ کے ہے جو اس کے مختلف مراحل کے حسیات و اعمال کو مربوط کر کے 'قومی انا' کا زمانی تسلسل محفوظ و قائم رکھتی ہے ۔''[۲]

اقبال کے نزدیک دنیا کی ہر چیز کا استحکام و ترقی خودی میں ہے ، اور خودی ہی ہر جگہ جوہر نما ہے ۔ حتیٰ کہ :

کبک پا از شوخیٔ رفتار یافت بلبل از سعیٔ نوا منقار یافت[۳]

از ہمہ بیگانہ آں مامک پرست گریہ مست و شیر مست و خواب مست

* * *

۱۔ منقول از سید عبد الواحد معینی ، مرتب ، ''مقالاتِ اقبال'' (لاہور : شیخ محمد اشرف ، ۱۹۶۳) ، ص ۱۵۸ - ۱۵۹ ۔

۲۔ ایضاً ، ص ۱۹۱ - ۱۹۲ ۔ ۳۔ ''اسرارِ خودی'' ، ص ۱۷ ۔

جستجو سرمایۂ پندارِ او از چرا، چوں، کے، کجا، گفتارِ او

• • •

چشمِ گیرایش فتد بر خویشتن دستکے بر سینہ می گوید کہ ''من''[۴]

زندگی احساسِ خودی کی رہینِ منت ہے ۔ احساسِ خودی نہ ہو تو زندگی موت سے بدتر ہے اور موت سے بدتر زندگی کو مرثیۂ حیات کا نام ہی دیا جا سکتا ہے ۔ دل کی دنیا کا چراغ ہی نہیں شب تاریک کا مہتاب بھی خودی ہی ہے ۔ اقبال فرماتے ہیں :

خودی کی موت سے مغرب کا اندروں بے نور
خودی کی موت سے مشرق ہے مبتلائے جذام !
خودی کی موت سے روحِ عرب ہے بے تب و تاب
بدن عراق و عجم کا ہے بے عروق و عظام !
خودی کی موت سے ہندی شکستہ بالوں پر
قفس ہوا ہے حلال اور آشیانہ حرام !
خودی کی موت سے پیرِ حرم ہوا مجبور
کہ بیچ کھائے مسلماں کا جامۂ احرام ![۵]

یہ تہذیب و تمدن جو افرنگ کا عطیہ ہے اقوامِ مغلوبہ کے لیے زہرِ ہلاہل ہے ، اس لیے کہ اس میں افرنگ کی شیطانی خودی تو رقصاں ہے مگر اپنی خودی کا نام و نشان تک نہیں جس کی وجہ سے اقوامِ مغلوبہ کا اپنا تشخص ناپید ہے ۔ فرماتے ہیں :

ترا وجود سراپا تجلیٔ افرنگ
کہ تو وہاں کے عمارت گروں کی ہے تعمیر !
مگر یہ پیکرِ خاکی خودی سے ہے خالی
فقط نیام ہے تو زر نگار و بے شمشیر !

• • •

۴- ''رموزِ بے خودی'' ، ص ۱۶۹ - ۱۷۰ -
۵- ''ضربِ کلیم'' ، ص ۷۹ - ۸۰ -

وجود کیا ہے ؟ فقط جوہرِ خودی کی نمود
کر اپنی فکر کہ جوہر ہے بے نمود ترا[۶]

* * *

گراں بہا ہے تو حفظِ خودی سے ہے ورنہ
گہر میں آبِ گہر کے سوا کچھ اور نہیں [۷]

* * *

نہ ہے ستارے کی گردش نہ بازیٔ افلاک
خودی کی موت ہے تیرا زوالِ عظمت و جاہ[۸]

* * *

یہ پیام دے گئی ہے مجھے بادِ صبح گاہی
کہ خودی کے عارفوں کا ہے مقامِ پادشاہی ![۹]

* * *

بے ذوقِ نمود زندگی موت تعمیرِ خودی میں ہے خدائی !
رائی زورِ خودی سے پربت پربت ضعفِ خودی سے رائی ![۱۰]

* * *

خودی ہو زندہ تو دریائے بیکراں پایاب
خودی ہو زندہ تو کہسار پرنیان و حریر ![۱۱]

* * *

زندگانی ہے صدف قطرۂ نیساں ہے خودی
وہ صدف کیا کہ جو قطرے کو گہر کر نہ سکے
ہو اگر خود نگر و خود گر و خود گیر خودی
یہ بھی ممکن ہے کہ تو موت سے بھی مر نہ سکے ![۱۲]

* * *

مہ و ستارہ مثالِ شرارہ یک دو نفس
مثالِ خودی کا ابد تک سرور رہتا ہے !

۶- ایضاً ، ص ۲۸ -
۷- ''بالِ جبریل'' ، ص ۷۰ - ۸- ایضاً -
۹- ایضاً ، ص ۶۷ - ۱۰- ایضاً ، ص ۷۹ -
۱۱- ''ضربِ کلیم'' ، ص ۷۵ - ۱۲- ایضاً ، ص ۲۵ -

فرشتہ موت کا چھوتا ہے گو بدن تیرا
ترے وجود کے مرکز سے دور رہتا ہے [۱۳]

معرفتِ خودی انسان کو دنیا ہی میں سر بلند نہیں رکھتی بلکہ خدا سے بھی واصل کر دیتی ہے اور عارفِ خودی کی رضا خدا کی "ہم رضا" ہو جاتی ہے - وہ خدا سے راضی ہوتا ہے اور خدا اس کی رضا کو پسند کرتا ہے - گویا انسان خودی کے استحکام سے خدا کا ہم رضا بن جاتا ہے - اگرچہ رضا خدا ہی کی ہوتی ہے مگر وہ صاحبِ خودی کی رضا متصور ہوتی ہے - "رضی اللہ عنہم و رضو عنہ" [خدائے تعالیٰ ان سے راضی ہوا اور وہ خدا سے راضی ہوئے] - اسی لیے فرماتے ہیں :

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے ؟ [۱۴]

اقبال نے خودی کی تربیت کے مندرجہ ذیل تین مراحل بتائے ہیں :

زندگی خود را بخویش آراستن — بر وجودِ خود شہادت خواستن

• • •

شاہدِ اوّل شعورِ خویشتن — خویش را دیدن بنورِ خویشتن
شاہدِ ثانی شعورِ دیگرے — خویش را دیدن بنورِ دیگرے
شاہدِ ثالث شعورِ ذاتِ حق — خویش را دیدن بنورِ ذاتِ حق
بیش ازیں نورِ ارمانی استوار — حی و قائم چوں خدا خود را شمار ! [۱۵]

اقبال نے خودی کہیں سے مستعار نہیں لی بلکہ اسلامی تعلیمات سے ماخوذ ہے اور اسرار لا الٰہ الا اللہ اس کا سرمایۂ وجود ہے - خودی توحید ہی سے استحکام حاصل کرتی ہے :

خودی کا سرِنہاں لا الٰہ الا اللہ
خودی ہے تیغ ، فساں لا الٰہ الا اللہ

۱۳- ایضاً ، ص ۶۳ - ۱۴- "بالِ جبریل" ، ص ۸۱ -
۱۵- "جاوید نامہ" ، ص ۱۳ - ۱۴ -

یہ دور اپنے براہیم[۴] کی تلاش میں ہے
صنم کدہ ہے جہاں لا الٰہ الا اللہ
کیا ہے تو نے متاعِ غرور کا سودا
فریبِ سود و زیاں ! لا الٰہ الا اللہ !

• * *

خرد ہوئی ہے زمان و مکاں کی زناری
نہ ہے زماں نہ مکاں ! لا الٰہ الا اللہ !
یہ نغمہ فصلِ گل و لالہ کا نہیں پابند
بہار ہو کہ خزاں لا الٰہ الا اللہ !
اگرچہ بت ہیں جماعت کی آستینوں میں
مجھے ہے حکمِ اذاں لا الٰہ الا اللہ[۶]

۱۶- ''ضربِ کلیم''، ص ۷ - ۸ -